مگاہا ملک

"جمشید..... اٹھ جا بیٹے' ڈھائی بج رہے ہیں۔ میرا چاند' اٹھ..... نیچے آجا۔"

"اف!" اس نے بیزاری سے کروٹ بدل کر ننھے سے لاؤڈ اسپیکر کو دیکھا۔ دادی جان کا روزمرہ کا اعلان نشر ہو رہا تھا۔

"دہی لا دے..... اٹھ جا..... بچے۔ آجا چاند' نیچے آجا۔"

"چاند بھی کبھی نیچے آیا ہے دادی!" وہ اٹھ کر چپل ڈھونڈنے لگا۔ "جو نیچے آجائے وہ چاند کیسا۔"

چپل بھی معمول کے مطابق غائب تھی' جنید روز سویرے اٹھ کر اس کی چپل پہن کر نیچے چلا جاتا تھا اور رات کو حسب معمول ننگے پاؤں اوپر آجاتا تھا۔

"کمینہ! یونیورسٹی سے لوٹے تو ٹانگیں توڑوں گا۔ اب پہنے میری چپل۔" اسے ننگے پاؤں پھرنے سے سخت چڑ تھی۔

واش روم کے سامنے پڑے غزل کے سلیپرز پیروں میں اڑسا کر وہ نیچے اترا۔

دادی جان حسب معمول کچن کے دروازے کے

ناولٹ

ساتھ پڑے لکڑی کے تخت پر اپنے پاندان کے آگے براجمان تھیں۔

جمشید کو ایک نگاہ دیکھ کر انہوں نے چھنگلی پر لگا کتھا پہلے چاٹا پھر چھنگلی بالوں میں پھیرلی۔

"بہو..... آگیا ہے جمشید..... اسے دہی کے پیسے دو۔"

کچن سے امی کا کوئی جواب موصول نہ ہوا وہ اس کے دیر سے اٹھنے پر ہمیشہ کی طرح ناراض تھیں۔ وہ بے زار بے زار سا دادی کے پاس بیٹھ گیا۔

"ارے بچے! جا منہ دھولے..... دور سے ہی سڑاند آرہی ہے۔" دادی نے سفید غرارہ سمیٹا۔ وہ برے برے منہ بناتا کونے میں بنے واش بیسن کی جانب بڑھ گیا۔

"اے تاج..... اب دو گی دہی کے پیسے؟" دادی

نے بالآخر سو کو ان کے نام سے پکارا۔

"یہ اپنے چونچلے تو پورے کر لے۔" تاج بیگم ہاتھ میں ٹرے لیے برآمد ہوئیں اور کڑے تیوروں سے بیٹے کو گھورا۔

"غضب خدا کا!" انھوں نے ٹرے دادی جان کے برابر دھری "اس میں جمشید کا ناشتا تھا" اور سلسلۂ کلام جوڑا۔ "دن کے ڈھائی بجے ہیں اور صاحب عالم کا ناشتہ ہو رہا ہے۔ گھر کے سب کام ادھورے پڑے ہیں۔ دہی کے بغیر ہانڈی ادھ گلی چڑھی ہے، باپ کے کپڑے ہفتے بھر سے دھلنے کو گئے ہوئے ہیں، روز آج کل، آج کل ہوتی ہے۔ غزل بے چاری روز کالج میں رستہ دیکھتی ہے کہ شاید قسمت یاوری کرے اور بھائی کی صبح کچھ جلدی ہو تو آرام سے اسکوٹر پر گھر آئے مگر روز بسوں کے دھکے کھاتی ہے۔ بھائی کو سونے سے فرصت نہیں۔ ڈھائی بجے اترتے ہیں۔ چار بجے تک ناشتہ کرتے ہیں، پانچ بجے سے موالی دوبی ہوتا ہے، جو ہوتا ہے تو رات کے دو بج جاتے ہیں۔"

"اے بہو! اُئی وی غریب تو پانچ بجے سے ہوتا ہے نا۔۔۔ تم تو مرغ کی بانگ کے ساتھ جو بولتی ہو، جو بولتی ہو تو رات کو سونے کے بعد ہی خاموش ہوتی ہو۔ بلکہ قطب الدین تو کہتا ہے کہ تم سوتے میں بھی بولتی ہو۔"

جمشید منہ میں برش لیے ہنسنے لگا۔ وہ دادی جان کا چہیتا پوتا تھا۔ اس کی کھنچائی کے جواب میں دادی "تاج بیگم کو یونہی آڑے ہاتھوں لیتی تھیں۔

"آپ کی بے جا طرف داریوں نے ہی محترم کا یہ حال کیا ہے اماں۔۔۔" تاج بیگم کلس کر رہ گئیں۔ "شروع دن سے ہی آپ کا یہی وتیرہ ہے، جہاں اسے کسی نے اچھے برے کی تمیز سکھائی وہیں آپ نے پنجے تیز کیے۔"

"دوری اوئی! سو میں کوئی کتا بلی ہوں؟ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔۔۔" دادی جان نے تیوری چڑھائی۔ تاج بیگم بڑبڑاتے ہوئے کچن میں گھس گئیں۔

جمشید منہ پونچھتا دادی کے پاس آ بیٹھا اور ٹرے کھسکا کر قریب کی۔

"بچے۔۔۔! ذرا جلدی اٹھ کر بہن کو تو لے آیا کر چاند۔۔۔!" دادی شہد کی طرح میٹھی ہو گئیں۔ "بسوں کے دھکے کھاتی آتی ہے غریب۔"

"ہاں! بس کا دھکا کھا کر تو وہ ہاسپٹل ضرور جا سکتی ہے۔ گھر نہیں لوٹ سکتا۔" اس نے حسب عادت ہانکی۔

"چپ رہ۔۔۔ مردود۔۔۔" دادی خفا ہو گئیں۔ "اماں نے سن لیا تو جوتا اٹھائے گی، بہن کے لیے کیسی بدفال نکال رہا ہے۔"

اسی لمحے صحن کا گلی سے ملحق دروازہ دھڑ سے کھلا اور غزل بیگم اندر داخل ہوئیں۔

دھوپ کی شدت سے چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا۔ ٹائٹ سے سفید یونیفارم میں چھوٹی سی توند نمایاں ہو رہی تھی۔ بڑا سا بیگ پشت پر لٹکائے وہ کسی مزدور کی طرح پیر گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہی تھی۔

"السلام علیکم!" دادی جان کے قریب پہنچ کر اس نے زوردار سلام پیش کیا۔ باہر سے آ کر اگر کوئی سلام کرنا بھول جاتا تو اس کی سلامتی کو دادی جان کے ہاتھوں کئی خطرات لاحق ہو جایا کرتے تھے۔

"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔ آج بڑی جلدی آ گئیں؟" دادی جان نے سر سے پیر تک اس کا بغور معائنہ کیا۔

"جی ہاں" آج ہماری بس کے ڈرائیور نے ریس میں حصہ جو لے لیا۔۔۔ مزہ آ گیا دادی۔" اس نے بیگ اتنی دور سے دادی کے پاس پھینکا، وہ اچھل کر رہ گئیں۔

"دوسری بس میں بھی ہمارے ہی کالج کی لڑکیاں تھیں "بس پھر کیا تھا" وہ شور مچا" وہ شور مچا زور لگا کے ہیا۔ زور لگا کے ہیا۔۔۔ ڈرائیور کو بھی جوش ہی چڑھ گیا۔۔۔" اس نے ایک جوتا اتار کر فرش پر مارا۔

"زوں۔۔۔ زوں۔۔۔ زن۔۔۔ ہر جگہ سے فراٹے بھرتا گزر گیا۔" دوسرا جوتا پہلے جوتے سے بھی آگے جا کر گرا۔

"مزا آ گیا دادی۔"

ماہا ملک

جذباتیت
شدت
حقیقت پسندی

ماہا کے ہاں ان تین خصوصیات کا حیرت انگیز امتزاج نظر آتا ہے۔ جسے بڑی ہنرمندی سے برتا گیا ہے۔ ماہا ملک کا ذہنی افق بہت وسیع ہے۔ اس میں تخلیقی صلاحیتیں ہیں اور وہ بڑی توانائی سے لکھ رہی ہے۔ اس نے بہت خوبصورت کردار تخلیق کیے ہیں۔ محبت اس کے ہاں ایک رنگ میں نہیں، بہت سے رنگوں میں منکشف ہوتی ہے اور زندگی کی حقیقی اور مکمل تصویر بناتی ہے۔

ماہا کرداروں کو بڑی خوش سلیقگی سے برتتی ہے۔ اس کے ہاں تہذیب و روایت اور جدت کا بہت خوبصورت سنگم نظر آتا ہے۔ اس نے روایتی کرداروں کو ایک نئے انداز سے دیکھا اور محسوس کیا ہے اور یہ اس کے قلم کا اعجاز ہے کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔

"وہ عمر جس کی آرزو کو اس سے محبت ہو گئی۔"

جو چلے تو جاں سے گزر گئے۔" کا یہ آخری جملہ ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں ماہا کے قلم کی طاقت عروج پر نظر آتی ہے۔ عورت، مرد اور رقیب اس اٹل تکون پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور لکھا جا رہا ہے۔ لیکن فیض کی طرح ماہا بھی رقیب کو ایک نئے انداز سے سامنے لائی ہے۔

اس کی تحریروں کی ایک خوبی شگفتگی اور برجستگی ہے۔ جس نے اسے ایک نمایاں مقام دیا ہے۔ وہ انتہائی فطری اور شائستہ مزاح لکھتی ہے۔ مزاح لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ ذرا سا قلم پھسل جائے تو مزاح پھکڑپن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن ماہا کی شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور محاوروں کا خوبصورت استعمال تحریر کو کہیں بھی ہلکا نہیں ہونے دیتا۔

ماہا کی تحریروں سے جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک خوش شکل، خوش سلیقہ، باوفا اور محبت و ایثار کے جذبوں سے مالا مال لڑکی کی ہے۔ وہ بیک وقت کئی متضاد خصوصیات کی حامل نظر آتی ہے۔ ایک طرف شدت اور دوسری طرف زندگی کے کڑے حقائق۔ اور ان کے درمیان توازن رکھنا۔ بلاشبہ بہت مشکل کام ہے۔ اس کی تحریروں میں جس تواتر سے یہ کردار آیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے اس میں کہیں نہ کہیں ماہا کی اپنی شخصیت موجود ہے۔

"اری تو لڑکی ہے، بم ہے کم بخت۔" دادی کے ایک زوردار ہاتھ نے کمر پر پڑ کر اس کا منہ کڑوا کر دیا۔

"جو پھٹتا ہے تو گونج زمانے بھر میں پھیل جاتی ہے۔ ادھر بستہ، ادھر جوتا اور زبان ہے کہ بندوق کی مانند تڑ تڑ تڑ۔۔۔ میدان جنگ میں اتری رہتی ہے ہر وقت۔۔۔ اٹھو یہاں سے۔۔۔ چیزیں سمیٹ اپنی، لڑکی ذات ہے تمیز سیکھ۔ ریسوں میں حصہ لیتی آئی ہے۔ گھڑ سوار کی اولاد بھلا بتاؤ، ان موئے ڈرائیوروں کو خوف خدا نہیں۔ ذرا ذرا سی بچیاں، اپنے ماں باپ کے دلوں کی دھڑکن ساتھ لے کر گھر سے پڑھائی کو چلتی ہیں، یہ خبیث اپنی دل لگیوں میں ننھی ننھی جانوں سے کھیلتے ہیں۔ ان کو کوئی پوچھنے، ٹوکنے والا نہیں۔ خدا انھیں غارت کرے۔۔۔ بے مہار ہاتھی۔۔۔ جانوں سے کھیلتے پھرتے ہیں۔۔۔ اور انھیں دیکھو۔"

انھوں نے سلسلۂ کلام توڑ کر غزل کو ڈھونڈنے کی کوشش کی، جو اب منظر سے غائب ہو چکی تھی۔

"بڑی خوش خوش گھر لوٹیں۔۔۔ ریس جیت کر آئی ہیں۔"

دادی کی تقریر، زوڑا سے نہ پا کر بڑبڑاہٹ میں بتدریج بدلتی گئی۔

"یہاں سب کے ڈھنگ نرالے ہیں۔"

❁ ❁ ❁

"اور یہ رہا آگا!" جمشید نے فخریہ پتا پھینکا۔ "وہ بھی چھپا کل۔"

غزل نے ناک چڑھا کر ہاتھ میں پکڑے پتے پھینک دیے اور بے دلی سے ٹانگیں ہلانے لگی۔ جنید خاموشی سے پتے سمیٹنے لگا۔

"یہ تم ہار کر منہ کیوں اتنے برے برے بناتی ہو؟" جمشید نے غزل کو چھیڑا۔

"میں بنا سکتی ہوں بھائی جان! کیونکہ میرا پہلے سے برا نہیں ہے۔"

"مطلب؟" وہ اس کی بات نہ سمجھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کے منہ کو پیدائشی برا کہہ رہی ہے جو مزید برا نہیں بن سکتا۔" جنید نے وضاحت کی۔ غزل اسے گھورنے لگی۔ جب کہ جمشید اسے گھور رہا تھا۔

"اپنی بے تکی وضاحتیں تم اپنے پاس نہیں رکھ سکتے؟ بس منہ کھولا اور اگل دیا جو کچھ گلے میں تھا۔" وہ جنید سے الجھ گئی۔

"میں گلے سے نہیں دماغ سے اگلتا ہوں۔" اس نے تفاخر سے کہا۔

"دماغ میں جو کچھ ہے وہ بھی تو نزلہ بن کر گلے میں ہی گرتا ہے تمہارے۔"

جنید کے کھلے ہاتھ نے گھونسے کا روپ دھارا تو وہ اڑ کر بستر سے اتر گئی۔

"بتاؤں گا کسی دن..." اس نے دھمکی دی تھی۔ "سارا کا سارا نزلہ تم پر گر جائے گا۔"

جمشید بنا کسی تاثر کے اس گفتگو کو سن رہا تھا۔ یوں بھی وہ گیم جیت کر مطمئن تھا۔

"جمشید، جنید، غزل... نیچے آجاؤ..." اچانک لاؤڈ اسپیکر پر کنول کی آواز گونجی تھی۔ "میں آئی ہوں۔"

"اپیا آ گئیں..." غزل میں یکایک بجلی بھر گئی۔ وہ نیچے کی جانب لپکی۔

"آہستہ۔ ڈائنوسار... سیڑھیاں نہ توڑ دینا..." جنید نے پیچھے سے کہا۔

وہ سنی ان سنی کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔ جمشید اور جنید بھی اٹھ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔

نیچے کنول اطمینان سے دادی جان کے تخت پر فروکش تھی۔ لائبہ اور بینو ٹی وی پر کارٹون لگا چکے تھے۔ اپنے گھر میں انہیں ٹی وی سے استفادہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا یہاں آتے ہی وہ ٹی وی کے کان مروڑ کر اپنا غصہ نکالا کرتے۔

غزل دوڑ کر تخت پر چڑھ گئی تھی۔

"ہائے اپیا... کتنے دن کے بعد آئی ہیں۔ میں تو ترس گئی تھی بچوں کے لیے..."

کنول فخریہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے باری باری ان تینوں سے مل رہی تھی۔

"سہیل بھائی نہیں آئے؟" جمشید نے استفسار کیا۔

"مجھے چھوڑ کر گئے ہیں کہیں... واپسی میں لینے آئیں گے۔" وہ بے فکری سے بولی۔

"آج آپ یہیں رک جائیں۔"

"ہاں کہ تو بچوں کے ساتھ مل کر اودھم مچائے۔" دادی جان نماز سے فارغ ہو کر وہاں آ چکی تھیں۔ "اپنی پڑھائی میں دھیان دے۔ امتحان نزدیک ہیں تیرے۔ اور بچی..." وہ کنول کی جانب متوجہ ہوئیں۔ "تم اپنی سناؤ خوش ہو۔"

"جی دادی جان... بہت خوش ہوں۔" وہ ثبوت بہم پہنچانے کو کھلکھلائی۔

"خوشی کا گول گپا تو بن چکی ہیں... اور کتنی خوش ہوں گی بھلا!" جنید کی زبان میں بہت دیر سے کھجلی ہو رہی تھی۔

اس کا تخت پر پھیلا ہوا ڈیل ڈول دیکھ کر وہ بار بار حیرت سے پلکیں جھپکا رہا تھا۔

"دیکھیں تو دادی... تخت کے طول و عرض میں ان کی بادشاہت ہے۔ ان کے سامنے تو غزل چھپکلی لگ رہی ہے۔"

دادی جان فخریہ مسکرائیں، جیسے کنول کی عظیم الشان مجسمہ گری میں ان کا ہاتھ ہو۔

"ہائے اللہ..." کنول کے چہرے پر اضمحلال کے تمام رنگ پھیل گئے۔ "جنید کے بچے میرا مذاق تو نہ اڑاؤ۔ ڈاکٹر کہتی ہیں خون کی کمی ہے جسم پھیل رہا ہے، آئرن ٹانک استعمال کروں۔ میں کوئی کھانے سے تھوڑا ہی موٹی ہوں۔"

"پھیل رہا ہے..." جنید کی آنکھیں مزید پھیلیں۔ "یعنی اپیا... ابھی پھیلنے کا عمل جاری ہے۔ مائی گاڈ۔ آخر آپ کی کھال میں گینڈے جیسی الاسٹی سٹی کہاں سے آگئی؟ اور ڈاکٹر کو یہ علم نہ ہو سکا کہ خون کی کمی سے جسم نہیں پھیلا بلکہ جسم کے اتنا پھیلنے سے خون کی کمی ہو گئی ہے۔ آخر بے چارا خون کہاں کہاں پورا پڑے...؟ خون ہی ہے۔ بیچارہ احمر تو نہیں۔ اور آئرن ٹانک کی چھوٹی سی بوتل بھلا کرے گی کیا؟ میں آپ کو لوہے کا ٹرک منگوا دیتا ہوں، وہ چبا جائیں تو شاید بات بنے اور رہی کھانے کی بات... تو... تو..."

اس نے کنول کے چہرے پر رونے سے چند لمحے پیشتر والی تمام علامات پائیں اور دادی کو جھک کر چپل ٹٹولتے ہوئے دیکھا تو اسپرنگ کی طرح اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔

"تو کھانا کوئی نہ کھائے... میں بریانی لے کر آتا ہوں۔" اگلے لمحے وہ باہر نکل گیا تھا۔

"دیکھا جمشید! سارے ہی مذاق کرتے ہیں۔" کنول روہانسی ہو رہی تھی۔ "بتاؤ نا میں کیا کروں؟"

"ارے بچی...!" جمشید کے لب کھولنے سے قبل ہی دادی بول پڑیں۔ "ان ناس پیٹوں کے مونہوں کو تو مذاق لگے ہیں۔ کسی چھوٹے بڑے کا ادب لحاظ نہیں ان کو۔ جب بولیں گے دل برا کرنے کو بولیں گے۔ خدا خدا کر کے تو کچھ جان پڑی ہے میری بچی میں..."

انہوں نے کنول کے بڑے سے سر کو اپنے نحیف و نزار بازوؤں میں بھرنے کی ناکام کوشش کی۔ کنول جھٹ اپنا سر ان کی گود میں رکھ کر مزے سے لیٹ گئی۔

جمشید اور غزل نے مسکراہٹیں چھپانے کو ادھر ادھر منہ گھمانا شروع کیے۔

"آئے ہائے بچی! ذرا ادھر سرک..." دادی لمحوں میں خوفزدہ ہو گئیں۔ "ان ہڈیوں میں اب اتنی سکت کہاں۔ ہائے ہائے... گھٹنا ٹوٹ گیا۔"

غزل کی ہنسی مزید اپنا آپ نہ چھپا سکی۔ جمشید بھی ہنس دیا۔ اور تو اور کچن کے دروازے پر کھڑی تاج بیگم بھی دبی دبی مسکرا اٹھیں۔

کنول مزید روہانسی ہو گئی، شرمندہ سی ہو کر وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم..." قطب الدین صاحب چلے آئے تھے۔ دادی جان کے آگے جھکے۔

"وعلیکم السلام... جیتے رہو..." دادی نے ان کی پیشانی چومی۔

"السلام علیکم ابو جان...!" ان تینوں نے مشترکہ سلام کیا تھا۔

قطب الدین صاحب نے باری باری تینوں کو پیار دیا۔

"تمہاری کنول بیٹی بھی آئی ہے۔ بچے کہاں ہیں۔۔؟" وہ وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

"اندر ٹی وی لگائے بیٹھے ہیں۔ گھر میں تو سہیل کے ابو انہیں اجازت ہی نہیں دیتے ٹی وی دیکھنے کی۔۔" کنول شکایتی انداز میں کہنے لگی۔

"یہ کلموا مرتا بھی نہیں۔" دادی جان زیر لب بڑبڑائیں۔ "کب سے اللہ کا عذاب بنا بیٹھا ہے۔" کنول کے سسر سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔

"اماں جان۔۔۔ اللہ سے ڈریں۔" قطب الدین صاحب حسب عادت ان کی بات پر خفا ہوئے۔ "کیوں پرائے گناہ اپنے سر لیتی ہیں۔"

"کیا غلط کہتی ہوں۔۔۔" وہ دادی جان ہی کیا جو اپنی غلطی مان لیں۔ "میں تو اس کے منہ پر کہہ دوں کہ میاں! اب بخشو سب کو۔۔۔ بہت ستا چکے۔ اب ٹکٹ کٹوا ہی لو وہاں کا۔۔۔"

"اور جو وہ آپ کو ایسا کہہ دے پھر۔۔؟" تاج بیگم دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی چلی آئیں۔

"تو سب سے زیادہ خوش تم ہی ہوگی بہو۔ کہ تمہاری دلی تمنا کسی نے تو کہی۔۔۔" دادی جان کے اطمینان میں رتی برابر فرق نہ پڑا۔

کنول، غزل، جمشید اور قطب الدین صاحب ہنس دیے۔ تاج بیگم اماں کو گھور کر رہ گئیں اور اماں مزے سے پان لگانے لگیں۔

"زہرا بیگم زوجہ صدر الدین کا ڈنکا پورے محلے میں بجا کرتا تھا۔" دادی جان نے چھنگلی سے کتھا چاٹ کر بالوں میں پھیری۔ "محلے والیاں جتنا پیار کرتیں اتنا ہی ڈرتی تھیں مجھ سے۔۔۔ بیبن خالہ مشہور تھی، پورے محلے میں شادی بیاہ، خوشی غمی، رسم تہوار، غرضیکہ کوئی موقع ہوتا۔۔۔ بیبن خالہ کو سب سے آگے آگے رکھا جاتا تھا۔ مجال ہے کہ میرے مشورے کے بغیر کوئی اپنی لڑکی کا رشتہ کہیں کر دیتا یا اپنے لڑکے کو کسی کاروبار سے جوڑ دیتا میری رائے مقدم ہوتی تھی۔۔۔"

"جو کہ اب تلک ہوتی ہے۔۔۔" تاج بیگم نے بڑبڑا کر سرد آہ بھری۔

ہمسائی شکورہ بی بی دھیرے سے مسکرا دیں۔

دادی جان گفتگو کی روانی میں نہ تاج بیگم کی سرگوشی سن پائیں، نہ ہی ہمسائی کی بے وجہ مسکراہٹ پر انہوں نے غور کیا۔

"اور جب تمہارے ابا میاں کا انتقال ہو گیا۔"

"میرے ابا میاں؟" شکورہ کو قدرے پریشانی ہوئی۔ "وہ تو ماشاء اللہ حیات ہیں۔۔۔ بی بی جان۔۔۔!"

"اوں ہوں۔۔۔ ہمارے سرتاج۔۔۔ صدر الدین۔۔۔" دادی نے وضاحت کی۔

"اچھا اچھا۔۔۔" شکورہ مطمئن ہو گئیں۔

"ہاں۔۔۔ تو جب تمہارے ابا میاں اللہ کی رضا سے مجھے چھوڑ گئے، تب تو محلے والوں نے یوں میرا غم بانٹا، مانو میرے پاس تو کچھ غم رہا ہی نہیں۔ یہ قطب الدین دس برس کا تھا۔ صائقہ چھ کی تھی۔"

"اور فائقہ تین کی۔۔۔" تاج بیگم نے ان کا جملہ مکمل کیا۔ "اماں! شکورہ بہن کو اب تو حفظ ہو گئی ہوگی یہ ساری تفصیل، ہر مرتبہ آپ یہی ساری داستان لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔"

"اری بہو! تم تو منہ کی بات چھین لیتی ہو۔۔۔ میں کیا شبنم ندیم کی فلمی کہانیاں دہراتی ہوں جو شکورہ کو بار بار سننے سے گھبراہٹ ہو۔۔۔ ہماری زندگی کے قصے ہیں۔ ہمیں تو جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ صبح سے رات ہو جائے تو ہم نہ تھکیں۔۔۔ اور ان کی باتوں میں تو حسن ہے۔۔۔ ان سے کوئی اکتا سکتا ہے؟ کیوں شکورہ۔۔۔ دل کی کہو؟"

"نہیں نہیں بی بی جان! میں تو پورے انہماک اور اشتیاق سے سنتی ہوں۔ ذرا بوریت محسوس نہیں ہوتی لیکن اب میں چلوں۔"

وہ موقع غنیمت جان کر فوراً کھڑی ہو گئیں۔

"کئی کام رکے ہوئے ہیں۔ لڑکیاں بالیاں بھلا کہاں خیال کرتی ہیں کہ ماں گھر پر نہیں ہے تو لاؤ ذرا کچن کا

جھاڑ لیں۔ کوئی چیز خراب نہ ہو جائے۔"

"ارے ہاں۔۔۔ یہ آج کل کی چھوکریاں یونہی ہیں۔" دادی جان ان کے اٹھتے ہی پورے تخت پر لیٹ گئیں گویا اسی لمحے کا انتظار تھا۔

"ہماری والی بھی ایسی ہی چھیلا بنی پھرتی ہے۔ کالج جاتی اور آتی دکھتی ہے۔ پھر یوں غائب مانو گدھے کے سر سے سینگ۔۔۔ مجال ہے جو کبھی دادی کا درد کرتا جسم دبا دے یا ماں کو دو گھڑی آرام دے، نہ! ہڑ دنگی کہیں کی۔"

تاج بیگم کے چہرے پر ناگواری کے تمام رنگ پھیلے پھر وہ ہمسائی کا لحاظ کر کے خاموش ہو رہیں۔ شکورہ کے جاتے ہی وہ ساس کے قریب ہو کر بولیں۔

"ہر ایرے غیرے کے سامنے بیٹیوں کی برائیاں نہیں کرتے اماں! زمانے بھر میں بات پھیلتی ہے۔ لیکن آپ کو سمجھانا ایسا جیسے کانٹوں کے جھاڑ پر کپڑا ڈال کر کھینچنا۔ اپنی ہی بات لیر لیر ہو جائے۔"

"آئے ہائے بہو۔۔۔!" دادی جان ذرا کی ذرا اطمینان سے لیٹی تھیں۔ اچھل کر بیٹھ گئیں۔

"تم سے یہ تو نہ ہوا کہ کبھی "لخت جگر" کو قریب بٹھا کر کوئی گن سکھاؤ، کچھ گر کی بتاؤ۔۔۔ میں نے یونہی ایک بات کہہ دی تو تم میرے سر کو آ گئیں۔ غضب خدا کا۔۔۔ سچ سننے کا حوصلہ نہیں۔ آج کل کی ماؤں میں، رکھ رکھاؤ، تہذیب سلیقہ سکھائی نہیں اولاد کو۔۔۔ لیکن سکھاؤ گی کیا؟ خود تم نے کبھی کچھ سیکھا ہو تو بچی کو بھی سکھاتیں۔۔۔"

"تو آپ سکھا دیں۔۔۔" تاج بیگم تپ ہی گئیں۔

"پوتی ہے آپ کی۔۔۔ دادی لگتی ہیں اللہ رکھے اس کی۔"

"آئے ہائے۔۔۔!" دادی جان پھر یکایک ٹھنڈی آہ بھر کر لیٹ گئیں۔ "ارے بہو! یہ نئے زمانے کے رشتے! مانو خون دودھ سے زیادہ سفید! یہاں ماں باپ کو کوئی کچھ نہیں جانتا تو دادی، نانی تو کس کھیت کی مولی ہیں وہ تو اور ہی زمانہ تھا جب بیبن خالہ کو سات گھر دور کا مہمان بھی سلام کر کے اپنے گھر جاتا تھا۔ مائیں اپنی بچیاں سارا دن کو میرے پاس چھوڑا کرتی تھیں، خالہ اسے قرآن پڑھا دو۔ خالہ اسے کچھ گرہستی سکھا دو، خالہ اسے سینا پرونا سکھا دو۔۔۔ اب تو اپنی پوتی بیٹ بلا لہراتی قریب سے گزرتی ہے۔ کہ دادی میں کرکٹ کھیلنے جا رہی ہوں۔ آئے ہائے!"

* * *

"چھکا۔۔۔" فلک شگاف چیخ کے ساتھ غزل دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بے تحاشا بھاگی تھی۔

نتیجتاً سامنے سے آنے والا شخص اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیٹ سے باوجود کوشش کے اپنا سر نہ بچا پایا۔

"اوہ ہو!" وہ پیشانی تھام کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

جمشید اور جنید گھبرا کر دوڑے، جب کہ شکورہ خالہ کی بیٹیاں حنا اور لقمہ اپنی اپنی جگہ پر دونوں ہاتھ لبوں پر سختی سے جما کر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

"انکل۔۔۔! انکل۔۔۔ بات سنیں پلیز۔۔۔!" غزل اس کے قریب دوزانو بیٹھی اس کے گال تھپتھپا رہی تھی۔

"تم بھی نا۔۔۔ غزل کی بچی۔" جنید نے دانت کچکچائے۔ "بلوائیوں کی طرح ڈنڈا لہراتی دوڑ رہی تھیں۔ اندھوں کو کرکٹ سے شغف ہونا تو نہیں چاہیے۔"

"اچھا اب رہنے بھی دو نا۔۔۔ انکل کو ہوش میں لاؤ۔" وہ موقع کی نزاکت کے پیش نظر جنید سے نہ الجھی۔

"کلوروفام لاؤ کہیں سے۔" جمشید سخت گھبرایا ہوا تھا۔

وہ اس ٹیم کا سب سے سینئر ممبر تھا۔ لہٰذا کسی ایسی ویسی بات پر سب سے زیادہ گھبراہٹ اس کی ہونا متوقع تھی۔

"کلوروفام؟" جنید جھنجھلایا۔ "بھائی جان؟ آپ بھی بے ہوش ہو کر ان کے برابر لیٹنا چاہتے ہیں کیا؟"

"میرا مطلب ہے۔۔۔ وہ کیا ہوتا ہے۔ ہوش میں

لانے کے لیے؟"

"تخلف۔۔۔" غزل چلائی۔ "میں سو رہی ہوتی ہوں تو دادی امی جان سے تخلف سنگھانے کو کہتی ہیں، بقول ان کے میں سوتی نہیں بے ہوش ہوتی ہوں۔"

"تخلف کی بچی۔۔۔" جنید نے بہن کو جی بھر کر گھورا۔ "حکیم کی دکان یہاں بغل میں نہیں ہے۔ تم جاؤ اپنی یونیفارم کی جراب لے کر آؤ جوتے سے نکال کر۔"

"اس کا کیا کرنا ہے؟" جمشید حیران ہوا۔

"انکل کو سنگھانا ہے اور کیا میں اس میں چائے چھانوں گا؟" وہ چڑ کر بولا۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ رہنے دو۔۔۔ بھائی جی رہنے دو۔۔۔ میں کون سا سچ مچ بے ہوش ہوں۔" انکل صرف جنید کی دھمکی سے کپکپا کر اٹھ بیٹھے۔

"میں تو جی۔۔۔ یونہی ذرا۔۔۔" وہ چوٹ سہلانے لگے۔

"باغیچے میں استراحت کو لیٹ گئے تھے۔" جنید طنزاً بولا۔

"او نہیں بیٹے جی۔۔۔ ذرا چوٹ کا اثر کم کر رہا تھا۔ ماشاء اللہ بچی جیتی رہو۔ نظر صاف کر دی۔ کئی پرانی باتیں بھی یاد آ گئیں۔"

"بس انکل۔۔۔!" غزل شرما گئی۔ "وہ تو ایسے ہی۔"

"انکل جب بھی کچھ یاد نہ آئے بلا تکلف چلے آیا کریں۔" جنید کی رگ شرارت پھڑک اٹھی۔ "غزل پیسے بھی نہیں لیتی اس آپریشن کلین اپ کے۔"

"ماشاء اللہ!" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بیٹے جی۔۔۔ کیا نام ہے آپ کا؟ خادم کو خورشید علی کہتے ہیں۔ قطب الدین صاحب کے آفس میں ہوتا ہوں، بڑی اچھی یاری ہے ہماری۔"

"ابا میں؟"

"اوہ!"

"نہیں۔۔۔"

ان تینوں کی ساری پھونک نکل گئی اور چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"لل۔۔۔ لیکن۔۔۔ انکل۔۔۔ وہ۔۔۔ ابو جان تو گھر پر نہیں ہیں۔" بالآخر جمشید کے دماغ کی بجلی بحال ہوئی، غزل کے تو سارے فیوز اڑ گئے تھے۔

"جانتا ہوں بیٹے جی۔۔۔ آپ شاید جمشید بیٹے ہو؟" انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"جی جی۔۔۔ انکل۔۔۔ یہ جنید بیٹا ہے۔ اور یہ غزل بیٹی ہے۔" جمشید، قطب الدین صاحب کے تصور سے کانپ رہا تھا۔ اول فول بکنے لگا۔ "حنا بیٹی اور نغمہ بیٹی کہاں گئیں؟"

وہ حنا اور نغمہ کو غائب پا کر جنید سے پوچھنے لگا۔

"رہنے دو بیٹے!" خورشید صاحب نے پھر شانہ تھپکا۔ "مجھے تو فی الحال صرف آپ سے کام ہے۔"

"فرمائیے انکل! ارشاد۔۔۔؟" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"ارشاد؟" وہ قدرے پریشان ہوئے۔ "وہ تو گھر پر ہے۔ اسے ساتھ نہیں لایا۔ آج تو صرف ایک نظر دیکھنا ہے۔ اس لیے میں اکیلا ہی آ گیا۔"

چند لایعنی قسم کی باتیں ان تینوں کے سر سے گزر گئیں۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کو سوال بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"کس کو ساتھ نہیں لائے آپ؟" جنید نے پوچھا۔

"ارشاد کا پوچھ رہے تھے نا آپ۔۔۔ میری تیسرے نمبر والی بچی ہے۔"

"ایک نظر کیا دیکھیں گے انکل؟" غزل نے ہونقوں کی مانند پوچھا۔

"گھر۔۔۔ بیٹے جی۔۔۔ گھر۔۔۔ آپ کے گھر کا اوپر والا پورشن ہم کرائے پر لے رہے ہیں۔ بس وہی ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔"

"ہائیں۔۔۔!"

ان کے سروں پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

❁ ❁ ❁

جمشید چاروں ہاتھ پیر پھیلائے پلنگ پر بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ جنید آرام کرسی پر سر کے پیچھے دونوں ہاتھوں کا تکیہ سا بنائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ غزل کمر پر ہاتھ رکھے ادھر سے ادھر پھر رہی تھی۔

"دادی جان تو میرا جینا عذاب بنا دیں گی۔" وہ بیچ کمرے میں رک کر فکر مندی سے گویا ہوئی۔ "سب سے زیادہ بیر انہیں مجھ سے ہے پورے گھر میں، بڑی مشکلوں سے اس گوشۂ عافیت میں آ چھپی ہوں۔ تب بھی وہ لاؤڈ اسپیکر پر دن بھر گالیاں سناتی ہیں۔"

"اور امی جان بازار کے چکر لگوا لگوا کر میرا قد چھوٹا کر دیں گی۔" جمشید نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "انہیں تو میری صورت دیکھتے ہی بازار کی سب دکانیں یاد آ جاتی ہیں۔"

"اور ابو جی۔۔۔ بیٹھس کے سوال کر کر کے زچ کر دیں گے مجھے۔" جنید نے تاسف سے سر ہلایا۔ "میرے لیے ایک سوال نامہ وہ ہمیشہ تیار رکھتے ہیں۔"

"بچے کل چار بیڈ روم ہیں۔" غزل سوچنے لگی۔ "ایک دادی جان کے تصرف میں ہے، ایک امی ابو کا، ایک پر جمشید بھائی جان قبضہ جمائیں گے اور ایک پر تم!" اس نے جنید کو گھورا۔ "میں آخر کہاں جاؤں گی؟"

"مجبوراً" تمہیں دادی جان کا کمرہ شیئر کرنا ہوگا۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔

"ہائے نہیں!" غزل نے دہائی دی۔ "میں مر جاؤں گی جنید!"

"چلو پھر قصہ ہی ختم ہو گیا۔ یہ خون خاک نشیناں تھا، رزق خاک ہوا۔ ویسے بھی میرا خیال ہے دادی جان کی نسبت تم قبر کے کیڑوں کے ساتھ زیادہ ایزی فیل کرو گی۔ وہ نسبتاً کم "اریٹیٹ" کریں گے۔" غزل نے جھرجھری لیتے ہوئے اس کو ایک دھموکا رسید کیا۔

"تم تو چاہتے ہی یہ ہو کہ میں مر جاؤں! منحوس کہیں کے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میں تو تمہارے ہی بھلے کو کہہ رہا تھا۔ دادی جان کے ساتھ کمرہ شیئر کرنے سے کئی گنا بہتر یہی ہے کہ آدمی مر جائے۔ دادا جان کی مثال سامنے ہے۔ دن بھر تو بندے کا جو حشر وہ کرتی ہیں اس کے لیے کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں، رات کو بھی ان کے خراٹے انسان کو ڈائنو سار کے زمانے کے خواب بنا کسی ٹکٹ کے دکھاتے ہیں۔ نیند میں انسان یہی سمجھتا ہے کہ یہ ڈائنو سارز کی آوازیں ہیں۔ خواب میں ایک خطرناک ڈائنو سار کو اپنا پیچھا کرتے دیکھ کر خوف سے آنکھ کھلتی ہے تو حلق دھوپ میں پڑے مٹی کے برتن سے زیادہ خشک ہوتا ہے اور جسم پسینے سے ایسا گیلا مانو پانی کے ٹب میں پڑے ہیں۔ تب انکشافات کا عمل شروع ہوتا ہے، پہلا انکشاف کہ وہ آواز ڈائنو سار کی نہیں دادی کے خراٹوں کی ہے۔ دوسرا انکشاف کہ بعد از مرگ جب قبر میں آنکھ کھلے گی تو معاذ اللہ کیا منظر ہوگا۔ تیسرا انکشاف کہ ابھی توبہ کے دروازے کھلے ہیں اور اللہ سب سے آخری آسمان پر موجود ہے۔ مانگ بندے مانگ، کیا مانگتا ہے۔ اور بندہ گھبرا کر یہی مانگتا ہے کہ یا اللہ! دادی جان کا کمرہ شیئر کرنے سے ہمیشہ بچانا۔۔۔!"

اس کی آواز میں مصنوعی گھبراہٹ کا راز جانتے ہوئے بھی جمشید آنسو پونچھنے لگا اور غزل آئندہ کے تصور میں ڈولی تھر تھر کانپنے لگی۔

"جنید۔۔۔ اللہ کا واسطہ کچھ کرو۔۔۔" وہ گھگھیائی۔ "ابو جان کو مناؤ۔۔۔ آخر ہمیں ایسی کیا ضرورت آن پڑی کہ ابو جی بیٹھے بٹھائے ہمارے سر کی چھت اور پیر کی زمین کے دشمن بن گئے۔ آخر کتنا کرایہ مل جائے گا اس بچ گلیا کا؟ اور پھر نقصان صرف میرا ہی تو نہیں۔ تم اور بھائی جان بھی تو معتوب ٹھہرو گے۔ بات بے بات عدالت سجے گی، مقدمہ چلے گا۔ سزا سنائی جائے گی۔ دادی جان کا بیر مجھ سے سہی، امی جان کی جھڑکیاں تو بلا شرکت غیرے بھائی جان کے حصے میں آئیں گی اور ابو جی کے ڈیلی ٹیسٹ سے تمہیں کون بچائے گا؟ ہم تینوں کی عافیت اسی میں ہے کہ یہ گوشۂ عافیت ہمارے قبضے میں رہے۔"

"ہوں!" اس نے سر ہلایا۔ "ایک بات سمجھ میں آئی ہے۔"

"وہ کیا؟" جمشید اور غزل تیر کی سی تیزی سے اس کے قریب آئے۔

"ابو جان کے مطلق العنان فیصلوں کو اگر کوئی شخصیت تبدیل کر سکتی ہے تو وہ ہیں دادی جان! ابو نے اگر اوپر والا پورشن کرائے پر اٹھانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میرے' بھائی جان کے یا تمہارے کہنے سے وہ اسے تبدیل نہیں کریں گے۔ امی جان بھی بس نام کی امی جان ہیں..... وہ بھی ہماری حمایت میں آواز بلند نہیں کریں گی۔ اب رہ گئیں دادی جان۔ تو جناب ابو اگر امریکہ ہیں تو دادی جان پکی پکی اسرائیل....."

"شرم کرو....." غزل نے قطع کلامی کر کے اسے گھورا۔

"ایک مثال تھی۔" اس نے بات جاری رکھی۔

"ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ یہ کہ دادی جان کو منانا ہو گا' ایک بار اگر دادی جان مان گئیں تو سمجھو دادا جان بھی گھر کو کرائے پر نہیں چڑھا سکتے۔"

"ہوں.....!" ان دونوں نے ایک گہری اور معنی خیز "ہوں" برآمد کی تھی۔

* * *

"یہ غزل کی بچی بھلا اس لائق ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شریف النفس کمرہ شیئر کر سکے؟ دادی جان سن لیجئے۔ آپ کے آرام اور سکون کے دن گنے جا چکے..... اب وقت آن پہنچا ہے کہ آپ رات دن' صبح وشام دادا جان سے ملنے کو بے قرار رہیں گی....."

جنید جوش خطابت میں بہت آگے نکل گیا تھا جب ایک دو ہتھڑ اسے واپس حقیقت کی دنیا میں لے آیا۔

"کم بخت ناس پیٹے..... جیسی تیری شکل ہے اس سے بری بات کرتا ہے تو....." دادی جان کا سفید جھاگ سا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔

"ارے مجھ سے دس' دس پندرہ پندرہ سال بڑی بوڑھیاں ابھی بیٹھی عیش کر رہی ہیں اور میں تیری نظروں میں کھٹک رہی ہوں..... بچے تو دادا' دادی کو پلکوں پر بٹھاتے ہیں اور ان کم بختوں کے خون کی سفیدی دیکھو ذرا....."

"دادی..... دادی جان! میری پیاری دادی.....!"

اس نے بات بگڑتے دیکھی تو غڑاپ سے غوطہ لگا ان کی گود میں گھس گیا۔

"اپنے اس لاڈلے پوتے کی بات کا غلط مطلب نہ لیں۔ بخدا میرا مطلب وہ ہرگز نہ تھا۔ جو آپ نے اخذ کیا۔ میں تو آپ کے بھلے کی سوچ رہا ہوں' آپ کی درازئ عمر کا طلبگار ہوں اور آپ کے سکون و آرام کے لیے دعاگو ہوں۔"

"پیچھے ہٹ مردار..... کب سے نہایا نہیں۔ پسینے کی کیسی بو آ رہی ہے۔" دادی سخت ناراض ہوئیں وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں تو صرف چار دن پہلے ہی نہایا تھا دادی جان! وہ غزل کی بچی تو ہفتوں نہیں نہاتی' پرفیوم وغیرہ اس فقیرنی کے پاس ہوتے نہیں' یوں ہی پھرا کرتی ہے اور خدا نے آپ کو سونگھنے کی بے پناہ صلاحیت سے مالا مال فرمایا ہے۔ آپ کی نفاست پسند طبیعت' بھلا اس گندی سندی کو اپنے کمرے اور اپنے بستر پر کیسے برداشت کریں گی؟ بتائیں؟"

"ہائیں؟" دادی نے شہادت کی انگلی ناک پر رکھی۔ یہ ان کی حیرت کا اظہار تھا۔

"لیکن میں کیوں اپنے کمرے میں اسے گھسنے دوں گی؟" قدرے توقف کے بعد انہوں نے دریافت کیا۔

"وہ اس لیے کہ نہ میں اسے اپنے کمرے میں گھسنے دوں گا نہ بھائی جان! آ..... آپ ہی رہ جاتی ہیں۔"

"کم بخت..... وہ غریب تو اوپر اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ تجھے کاہے کے درد اٹھ رہے ہیں؟"

"لیجئے!" جنید نے گہری سانس بھری۔ "زلیخا مرد تھی یا عورت! ارے دادی جان..... اتنی دیر سے وہی تو عرض کر رہا ہوں۔ ابو جان اوپر والا پورشن کرائے پر اٹھا رہے ہیں۔ بھائی جان' میں اور غزل اپنے اپنے کمروں سے "جلا" کیے جا رہے ہیں۔ جلا کمرہ! کیسی اصطلاح ہے؟"

"ہائیں!" دادی سوچ میں پڑ گئیں۔ "یہ قطب الدین کو کیا سوجھی بھلا.....؟"

"وہ انکل تشریف نہیں لائے تھے کل۔۔۔ وہی۔۔۔ لمبے قد اور سوکھے چہرے والے۔۔۔ وہ گھر دیکھنے ہی تو آئے تھے۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے۔"

"اور۔۔۔ اور۔۔۔ ابو جان نے آپ سے اجازت تک لینے کی ضرورت محسوس نہ کی؟ بوڑھی ماں سے پوچھے بغیر ہی اپنے فیصلے آپ ہی آپ۔۔۔ چ چ چ۔۔۔"

"تمیز۔۔۔ میرا قطب الدین ایسا نہیں۔" دادی جان نے غرارہ سمیٹ کر پہلو بدلا۔ "اس نے فیصلہ کیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔"

"لیکن آپ بھی تو سوچیے دادی! اس فیصلے کے مضمرات پر غور فرمائیے۔ سب سے زیادہ خلل جس شخصیت کے آرام میں پڑے گا وہ آپ ہیں۔"

"میں۔۔۔؟" دادی نے بھنا کر اسے دیکھا۔ "ارے میرے کیا سر لا بٹھائے گا کرائے دار۔"

"کرائے دار نہ سہی، بھائی جان، غزل اور۔۔۔ اور۔۔۔ میں بھی۔۔۔ ہم تو آپ کے سر پر۔۔۔ میرا مطلب ہے غزل، غزل سارا دن یہاں نیچے رہے گی۔ سوچیے! وہ تو چلتی ہے تو زلزلہ آجاتا ہے۔ بولتی ہے تو صور اسرافیل پھونکتی ہے۔ ہنستی ہے تو۔۔۔ تو۔۔۔" "اسے کوئی مناسب تشبیہ نہ سوجھی۔ "اور اس کے گانوں کا شوق! توبہ، میرے اللہ توبہ۔۔۔ آپ کی آخرت تو گئی دادی جان۔"

"ٹھلو ہے۔۔۔" ایک دو ہتھڑ پھر اس کی کمر پر برسا۔ "اچھا بولا کر۔"

"ہائے ہائے۔۔۔ آخر آپ سمجھتی کیوں نہیں دادی جان؟" وہ کراہا۔ "میں پڑھوں گا کیسے؟ کنول آپی کے بچے سارا دن یہاں دندناتے ہیں۔"

"تیری تو آنکھ میں کھٹکتے ہیں وہ۔۔۔"

"آپ کی عبادت میں کتنا خلل پڑے گا۔۔۔ آپ تو بلاشرکت غیرے اس پورشن کی مالکہ ہیں۔" بول بول کر اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔

"آنے دے قطب الدین کو۔۔۔" دادی جان اطمینان سے پاندان کھول کر بیٹھ گئیں۔ "میں کرتی ہوں بات۔"

"ہاہ!" وہ گہرا سانس بھر کر چکرا کر کرسی پر گرا۔ پردے کے پیچھے کھڑے جمشید اور غزل ہاتھ ملانے لگے۔

❁ ❁ ❁

"اماں! ان کے بھلے کے لیے ہی کر رہا ہوں۔ اور اپنے بھلے کے لیے۔ ان تینوں کو روٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ بوڑھے ماں باپ کا احساس نہیں۔" قطب الدین صاحب چڑے بیٹھے تھے۔

اے قطب الدین! بچے ہیں کیوں بے گھر کرتا ہے ان غریبوں کو، اپنا الگ بیٹھے آرام سکون سے پڑھتے ہیں۔ اپنا اپنا کمرہ ہے تینوں کے پاس۔۔۔ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں فساد نہیں۔"

"پڑھتے نہیں ہیں۔ وقت کا زیاں کر رہے ہیں۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔ آپ سیڑھیاں چڑھ نہیں سکتیں۔ تاج کو گھر کے کاموں سے فرصت نہیں میں سارا دن آفس میں۔۔۔ کوئی ان پر نگران نہیں، اپنی مرضی سے سارا دن پڑے سوتے ہیں۔ یہاں تاج ذرا ذرا سے کاموں کو بیٹھی رہتی ہے۔"

"ارے نہیں بیٹا! وہ تو نے لگوایا تو ہے اوپر۔۔۔ کیا کہتے ہیں، مسجد والا؟"

"لاؤڈ اسپیکر۔"

"ہاں وہی، میں تو سارا دن اس میں بولتی ہوں۔ جمشید تو پہلی آواز پر نیچے آتا ہے۔"

"ان کا ایک ہی علاج رہ گیا میرے پاس۔ انٹر کام کی سریلی گھنٹیوں کا تو ان پر اثر نہیں تھا۔ ریسیور اٹھا کر رکھ دیتے تھے، بیل لگوائی تو اس کا بٹن آف کر دیتے تھے۔ ایک یہی طریقہ تھا میرے پاس۔" وہ سخت بھنائے ہوئے تھے۔ "نیچے سے مائیک آن کر کے انھیں سخت سست سنائی جائے۔"

"اور تو کچھ نہیں اماں جان! چار پیسے ہی ہاتھ آئیں گے۔ ایڈوانس کی رقم سے گھر کی مرمت وغیرہ کروائیں گے۔ یہ جمشید صاحب، دو سال سے سول انجینئرنگ کی

ڈگری لیے بیٹھے ہیں۔ چار بجے سو کر اٹھتے ہیں، بقیہ وقت بچوں کی طرح کھیل کود کر گنوا دیتے ہیں۔ دوسرے حضرت، چرب زبان، مارے بندھے یونیورسٹی چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے کیا پڑھ کر آتے ہیں، کچھ پتا نہیں۔ اس عمر میں بچوں سے بدتر ہیں دونوں۔۔۔ اور یہ سب بے فکری اسی لیے ہے کہ سب سے بچ کر اوپر بیٹھے رہتے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے کٹ کر، خود میں گم ہیں۔ نیچے رہیں گے تو ذرا انسان بن جائیں گے۔ میری اور آپ کی نظروں میں رہیں گے۔ بس اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔"

دادی جان پھر سوچ میں گم تھیں۔

"اور پھر ان کو مشکل کیا ہے؟ نیچے دو بیڈ روم خالی ہیں۔ ایک میں دونوں لڑکے رہیں گے اور ایک میں غزل۔۔۔ کنول بھی آجایا کرتی ہے تو وہ غزل کے کمرے میں رہ لیا کرے گی۔ بڑوں کی نظروں کے سامنے رہیں گے تو سدھرے رہیں گے تینوں۔"

"ہوں!" دادی بالآخر متفق ہو گئیں۔ "کن لوگوں کو دے رہے ہو؟"

"میرے بہت اچھے دوست ہیں خورشید علی صاحب! ان کی فیملی ہے۔ وہ تو گھر پسند کر گئے ہیں۔ کل ان کی فیملی دیکھ کر جائے گی۔ ذرا دھیان رکھیے گا مہمان داری کا۔"

"آں ہاں۔۔۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اور تاج ہیں نا!" دادی نے پاندان ٹٹولا۔

❁ ❁ ❁

"سچی گل دساں؟ میں تے جی کرائے کرونے دے حق وچ نئیں۔ گھر ہووے تے اپنا۔ پرائی چھت تھلے رہن دا کی مزہ؟ کیوں اماں جی؟"

خاتونِ خانہ نے فراٹے بھرتی زبان کو چند گھڑیوں کے لیے روک کر دادی جان سے پوچھا۔

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں بھئی ہاں!" دادی جو ایک محویت کے عالم میں ناک پر شہادت کی انگلی دھرے انھیں تکے جا رہی تھیں، گڑبڑا کر رہ گئیں۔

"نجانے کیا بولے جا رہی ہے۔" وہ منہ میں بڑبڑائیں۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ یہ رول لیجیے نا۔" تاج بیگم، ساس کا جملہ سن کر گڑبڑا کر ان سے مخاطب ہوئیں۔

"تکلف نہ برتیں۔۔۔ اب تو ایک ہی گھر میں رہنا ہے۔" وہ ہنسیں۔

"آہو بھنے۔۔۔ پڑوسیاں دا بوت حق ہوندا اے۔۔۔ اسیں تے کدی فرق نئیں کیتا۔۔۔" وہ رول کھانے میں مشغول ہو گئیں۔

"پیسہ تے بوت اے ساڈے کول۔۔۔ میں آکھیا وی۔۔۔ اپنا گھر بناؤ۔۔۔ ساڈوں کی لوڑ اے کرائے دے گھراں دی۔ پر مانے نئیں خورشید علی۔ آپی کردے آں ہمیشہ۔" وہ شوہر سے شاکی تھیں۔

"چلو جی۔۔۔ ساڈوں کی۔۔۔؟ تن کڑیاں آں۔ تیناں نے چلے جانا سیاں کے۔۔۔ فیر کتھاں گے۔ اپنے کوٹھے چلے جاواں گے۔ کیوں اماں جی؟"

"ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ آں ہاں۔۔۔" دادی پھر بوکھلائیں۔

"اچھا بہن جی۔۔۔ میں ہن جلدی آں۔۔۔ گھر میتوں تے چنگا لگیا، کڑیاں کسی ویلے آن کے دیکھ جاوں گی۔"

"ضرور ضرور۔۔۔" تاج بیگم انھیں رخصت کرنے گیٹ تک گئیں۔

واپس لوٹیں تو ساس کو کسی گہری فکر میں غلطاں و پیچاں پایا۔ وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

"اے بہو! ذرا سنو تو۔۔۔" دادی نے دروازے پر ہی پکار لیا۔

"جی اماں۔۔۔" وہ پلٹ آئیں۔

"یہ کیسے لوگوں کو گھر دے رہا ہے قطب الدین؟"

"کیوں اماں۔۔۔ کیا ہوا؟"

"اری۔۔۔ جنے کیا بولتی ہے۔ میرے تو پلے کچھ نہیں پڑا۔۔۔ بھلے سے گالیاں ہی دے جائے نیک بخت۔"

"ارے نہیں اماں۔۔۔" تاج بیگم ہنس دیں۔ "ہمسا۔۔۔

بھلی عورت ہے 'گالیاں کیوں دینے لگی۔ بس زبان زبان کا فرق ہے۔ انسانوں میں تو تفریق نہیں۔ قطب الدین صاحب نے کچھ دیکھ کر ہی کر دیا ہوگا۔"

دادی جان خاموش تو ہو گئیں مگر ان کے چہرے پر وہ پہلی سی بشاشت نہ تھی۔

❁ ❁ ❁

"دیکھا آپ نے دادی جان۔۔۔ آخر کو ہمارے خدشات درست ثابت ہو گئے۔"

وہ تینوں دادی جان کے تخت پر براجمان تھے اور ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ دادی بیک وقت اتنے افراد کو اس بے تکلفی کی اجازت دے دیں۔

"ارے مجھے کیا پتا تھا کہ قطب الدین کی عقل گھاس چرنے گئی ہے۔" دادی تاسف سے بولیں۔ "اب اپنا ہم زبان ملے تو اچھا بھی لگتا ہے۔ تو ہی اپنے جی کی دو باتیں کسی سے کہہ لے۔ اپنا بوجھ ہلکا کرے۔ ارے اس کی گاڑھی زبان سے تو میرے سینے پر دو من بوجھ بڑھ گیا۔"

"بس دادی جان! آپ ابو جی سے کہیں کہ ان لوگوں کو انکار کر دیں۔" غزل نے جوش سے چٹکی بجائی۔

"تم لوگوں کا کام پھر بھی نہیں ہونے والا۔۔۔" دادی جان چڑ گئیں۔ "ایک کو انکار کرے گا۔ دس اور آجائیں گے۔ بے گھروں کی کمی نہیں دنیا میں۔"

"اور ہم تینوں بھی اب ان میں شامل ہونے والے ہیں۔" جمشید نے آہ بھری۔

"خدانخواستہ! میرے چاند' تجھے جگہ کی کمی ہے کوئی۔ ایسے دس گھر تجھ پر سے وار دوں میں۔" دادی جان کو بڑے پوتے اور بڑی پوتی سے جتنی زیادہ محبت تھی 'چھوٹوں پر اتنی ہی خفگی کا اظہار کیا کرتی تھیں۔

"دس چھوڑ کر صرف ایک گھر وار دیں دادی یا وہ بھی محض اوپری منزل۔۔۔ بھائی جان پر سے وار کر بھائی جان کو ہی دے دیں۔" جنید بولا۔

"ارے باپ کو دشمن نہ سمجھو! تمہارے بھلے کو ہی کرتا ہے جو بھی کرتا ہے۔ بڑا دانش مند ہے میرا قطب الدین۔"

"جی ہاں! صاف ظاہر ہے دانش مندی!" جنید طنزاً بولا۔

"کم بخت۔۔۔" ایک چپت اس کا مقدر ہوئی۔ "باپ ہے تیرا۔ اچھا بولا کر۔ چل اٹھ یہاں سے۔۔۔ نمار آکو سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔"

"دادی!" اس نے دہائی دی۔ "کل تو نہایا ہوں۔ یہ آپ کی ناک بناتے وقت اللہ نے کون سا میٹریل استعمال کیا تھا۔ اب اس میٹریل کو امریکہ بہادر حساس آلات بنانے میں استعمال کر رہا ہے شاید۔۔۔"

"امریکہ کا نام نہ لیا کر میرے سامنے۔۔۔ ناس پیٹا مسلمانوں کا دشمن۔۔۔ بہادر ہوتا تو اسامہ سے یوں نہ ڈرا کرتا۔"

دادی جان کی سیاسیات سے قطع نظر کیے وہ اپنی الجھنوں میں گرفتار بیٹھے تھے۔

❁ ❁ ❁

اوپری منزل پر مرمت کا کام جاری تھا' خورشید علی اور ان کی بیگم نور بانو کام کا جائزہ لینے آئے ہوئے تھے۔ وہ سیڑھیاں جو صحن میں اترا کرتی تھیں۔ اوپر دروازہ لگا کر بند کر دی گئی تھیں۔ لان کی جانب سیڑھیاں نکال کر مرکزی گیٹ کے ساتھ ایک چھوٹے گیٹ کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔

کمروں میں دیوار گیر الماریاں بن رہی تھیں۔ بڑھئی اور مستری اپنے اپنے کام کر رہے تھے۔

وہ آہستگی سے چلتا ہوا خورشید علی اور نور بانو کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم انکل! آنٹی!"

وہ دونوں ہی مڑے تھے۔

"جیتا رہ پتر!" نور بانو نے اسے دونوں ہاتھ سر پر پھیر کر پیار دیا۔

"نیچے آئیں نا۔۔۔ کچھ چائے پانی۔۔۔ ہو جائے۔"

"نہ پتر۔۔۔ ہن چلاں گے بس۔۔۔"

خورشید صاحب جواب دینے کے لیے بس منہ ہی کھولتے تھے۔ اتنی دیر میں برابر سے تیار جواب آجاتا تھا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی آپ لوگوں کو۔۔۔ کسی قسم کی شکایت۔"

"نہیں بیٹے جی' بالکل نہیں۔" اس مرتبہ خورشید صاحب کامیاب ہوئے۔ "تکلیف کیسی۔۔۔ کس بات کی۔"

"وہ۔۔۔" جنید نے تھوک نگلا۔ "جن۔۔۔ جنات کا کیا بھروسہ۔۔۔ کب کس وقت کیا کریں۔ میرا مطلب ہے کسی سے ذکر مت کیجئے گا۔ بس پھر سکون رہے گا۔ زبان بند رکھو تو یہ کچھ نہیں کہتے۔"

ان دونوں کے چہروں پر تذبذب کے آثار پیدا ہوئے۔

"اسیں سمجھے نئیں پتر۔۔۔ تسی کی کیندے او۔۔۔" خورشید صاحب کا منہ کھلا مگر بولی نور بانو تھیں۔

"کچھ نہیں آنٹی۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے گھبرانے کی بھرپور اداکاری کی۔ "ابو جی کو پتا چل گیا تو میری خیر نہیں ہے۔ مجھے کیا خبر تھی۔ ابو جی نے آپ کو پہلے سے نہیں بتایا۔"

"نہ پتر۔۔۔ توں دس ساہنوں۔۔۔ اسیں کچھ نئیں کیندے کے نوں وی۔ توں دس۔۔۔"

جنید نے تھوک نگل کر ادھر ادھر دیکھا۔

"آپ لوگ پہلے مجھ سے وعدہ کریں کہ ابو جی کو پتا نہ چلے میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔"

"وعدہ ہے بیٹے جی! وعدہ ہے۔"

خورشید صاحب اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے راج مستری سے قدرے فاصلے پر لے گئے۔

جنید آہستہ آہستہ ان سے کچھ کہنے لگا۔ ان کے چہرے پر فکر کی لکیریں نمودار ہونے لگیں۔ ذرا سے فاصلے پر کھڑی نور بانو کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔

❁ ❁ ❁

"کمال ہے۔ یعنی۔۔۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔۔۔ حد ہو گئی یعنی کہ۔۔۔" بہت دیر سے قطب الدین صاحب خود سے الجھ رہے تھے۔ الجھے چلے جا رہے تھے۔

دادی جان نے تسبیح روک کر زور و شور سے آگے پیچھے ہلنا بند کیا۔

"قطب الدین! اب بس کر۔ کیا دیوانوں کی طرح خود سے الجھے جا رہا ہے۔ کوئی دو آنے کا بھی فائدہ ہے اس میں؟"

"اماں۔۔۔ اماں فائدے کی بات چھوڑیں! یہ جو اوپر میں نے پچاس ہزار کا کام کروا لیا ہے وہ کون بھرے گا ان لوگوں کو' ان کا ایڈوانس تو لوٹانا پڑے گا۔ اور ایڈوانس کی رقم میں نے پوری کی پوری گھر پر لگا دی ہے۔"

"ارے۔۔۔ ان بے زبانوں کو خدا پوچھے' بتاؤ کوئی شرافت ہے؟ اتنا ڈھیر ہمارے سروں پر لاد کر کیسے اطمینان سے کہہ دیا کہ گھر نہیں چاہیے۔ تم نے تو میرا منہ نہیں کروایا ان سے۔ میں خوب جھتی۔۔۔ اور کچھ نہیں تو دس باتیں تو سناتی' تم تو فون پر کھسیا کھسیا کر رہ گئے۔ بتاؤ' شرافت ہے؟"

دادی جان تسبیح رکھ کر ہاتھ کا پنکھا جھلنے بیٹھ گئیں۔

"اماں! بہت پرانا کولیگ ہے میرا۔ برسوں کی شناسائی ہے۔ کیا کہہ سکتا ہوں اور پھر کام تو ہمارے اپنے گھر میں ہوا ہے۔ وہ گھر تھوڑا ہی اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

انہوں نے تاج بیگم کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لی۔

"اے لو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار!" دادی کی انگلی ناک تک پہنچ گئی۔ "ارے قطب الدین! تم نے تو بوڑھے ہو کر گنوایا۔ وہ بڑھاپا کیا جس میں تری کو دو پیسے کی عقل نہ آئے۔ ارے پوچھنا تو تھا ان سے کہ ایسی کیا افتاد پڑی آنا" "فانا" ایک فون کھڑکا دیا۔ سارے گھر کو مصیبت میں ڈالا۔ ارے میرے بچے! کتنا پریشان ہوئے۔ غریبوں نے کھانا کم کر دیا۔ ایسی منحوس صورت نکل آئی تینوں کی تم نے کیسی خواری جھیلی۔ کہاں

کہاں سے مزدور پکڑے۔ ان کے نخرے اٹھائے۔ سروں پر کھڑے ہو کر کام کروایا۔ تاج بے چاری چائے پانی کر کر کے نڈھال ہو گئی۔ اور تم کہتے ہو' برسوں کی شناسائی ہے۔ ارے اس موئے کو لحاظ نہ آیا برسوں کی شناسائی کا؟"

قطب الدین صاحب خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

"خیر خیر۔" دادی نے سانس بھر کر پاندان کھولا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میرے اکاؤنٹ سے روپیہ نکلوا کر ان کا ایڈوانس واپس کرو۔ خیر سے کوئی دوسرا کرائے دار ڈھونڈ لیں گے۔ کہاں مجھ سے تمہاری ایسی صورت دیکھی جاتی ہے۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔"

❊ ❊ ❊

"ہپ ہپ ہرے..... ہپ ہپ ہرے....." وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ڈانس کر رہے تھے۔

جمشید دیوانوں کی طرح بیٹھا ہنس رہا تھا اور تالیاں پیٹ رہا تھا۔

"دیکھا تم نے غزل کی بچی!" جنید نے رک کر اس کی چٹیا کھینچی۔ "ہمارے انڈر کام کرنے کے فوائد..... ساڈے نال رہو گے تے عیش کرو گے۔"

"ہونہہ! خیر جانے دو' یہ آخری آئیڈیا بھائی جان کا تھا۔ تم نے تو صرف اس پر عمل ہی کیا ہے۔"

"ارے رائٹر جو چاہے لکھ دے' جب تک پرفارمر اپنی اداکاری کے جوہر نہ دکھائے' ڈرامہ نہیں بنتا۔ کیا سمجھیں۔"

"مزے کی بات یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر بھی اتر گیا اور کمروں میں الماریاں بھی بن گئیں اور تو اور واش رومز میں ٹائلز بھی نئے لگ گئے۔ یعنی ایک تیر سے کئی شکار۔" جمشید بولا۔

"یعنی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں....." جنید نے گرہ لگائی۔

"اور یعنی آم کے آم' گٹھلیوں کے دام....." غزل نے نعرہ لگایا۔

"اور..... اور....."

جمشید کا اگلا محاورہ منہ میں ہی رہ گیا۔ تاج بیگم کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

"لعنت ہو ایسی اولاد پر۔" وہ سخت غصے میں تھیں۔ "کب سے صحن میں کھڑی آوازیں دے رہی ہوں' مجال ہے جو کسی کے کان پر بھی جوں رینگنے۔"

"جوئیں تو صرف غزل کے سر میں ہیں امی جان! اسے ڈانٹیں۔" جنید دبا دبا سا بولا۔

"بند کرو بکواس۔ لوتھے کے لوتھے بیکار بیٹھے ہیں۔ ناکارہ اولاد! چلو تینوں نیچے۔ آج سے تینوں کا اوپر آنا بند ہے۔ بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا تمہارے ابو نے۔"

"امی جان!" ان تینوں کا مشترکہ احتجاج فضا میں گونجا۔

"چلو نیچے' میں کہتی ہوں لڑکی! تم چائے کا پانی رکھو اور جمشید! تم دوڑ کر جاؤ' بازار سے سموسے اور چکن رولز لے کر آؤ۔ جنید! تم میز صاف کر کے برتن رکھو۔"

"ہائیں' کون آیا ہے امی جی!" غزل نے پوچھا۔

"مہمان ہیں۔" وہ مختصراً بولیں۔

"کون مہمان؟"

"خورشید علی صاحب اور ان کی فیملی۔ ملنے آئے ہیں وہ لوگ۔" امی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔

جنید بے ہوش ہو کر بستر پر گر پڑا۔

"ارے' اسے کیا ہوا بھائی جان!" غزل حیران ہوئی۔

"چند لمحوں پہلے جو کریڈٹ لے رہا تھا' وہی لے ڈوبا۔" جمشید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

"رائٹر چاہے کچھ بھی لکھ مارے' پکڑا پرفارمر جاتا ہے۔ کیا سمجھیں۔"

❊ ❊ ❊

ڈرے' سہمے وہ تینوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔

اندرونی منظر توقعات کے عین برعکس تھا۔

تین گوری چٹی صحت مند کڑیاں صوفوں پر براجمان دادی جان سے کچھ کہہ کر بے تحاشا ہنسے جارہی تھیں۔ کونے میں بیٹھے خورشید علی مسکرا رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" آواز صرف غزل کی تھی۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ جمشید اور جنید غائب تھے۔

"وعلیکم السلام۔" وہ تینوں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگیں۔

غزل نے باری باری ان سے مصافحہ کیا۔ خورشید صاحب نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ بہنیں آئی ہیں بیٹے جی آپ کی' ملیں ان سے۔ میں ان کو بتا رہا تھا' غزل بیٹی کو کرکٹ کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔"

غزل چور سی بن گئی۔ دادی جان اسے گھور رہی تھیں۔

"یہ میری بڑی بیٹی شمشاد ہے' یہ منجھلی ہے دلشاد اور یہ سب سے چھوٹی ارشاد۔" خورشید صاحب نے تعارف کروایا۔

غزل ان سے متاثر نظر آرہی تھی۔ وہ تینوں دراز قامت' بے تحاشا گوری' اور خاصی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔

"مجھے تو بھوت پریت' آسیب کی کہانیاں بڑی پسند ہیں جی۔" شمشاد کہنے لگی۔ "ابو جی نے جب بتایا کہ آپ کے گھر میں بھوت رہتے ہیں تو میں نے کہا۔ میں نے تو ضرور دیکھنا ہے وہ گھر بھلا بھوت گھر کیسا لگتا ہے۔ آپ کو بالکل ڈر نہیں لگتا؟"

وہ غزل سے پوچھنے لگی۔

"مجھے..." اس نے تھوک نگل کر دادی جان کو دیکھا جو شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ "مجھے تو... بہت ڈر لگتا ہے... مم... میں... چائے لاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر جھپاک سے نکل گئی۔ کچن میں آکر پناہ لی۔

"مجھے چھوڑ کر بھاگ لیے دونوں۔" وہ دانت پیس کر بڑبڑانے لگی۔ "بخشوں گی نہیں۔"

"کس پر خفا ہو رہی ہو؟" تاج بیگم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"بھائی جان اور جنید... کہاں بھاگ گئے دونوں؟"

"بھاگ گئے؟ اندر دولہا بن رہے ہیں دونوں۔ کپڑے بدل کر خوشبو میں نہائی جارہی ہیں۔ مجھ پر خفا ہیں کہ میں نے یہ نہیں بتایا ڈرائنگ روم میں لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ذرا حال دیکھو آج کل کے لڑکوں کے۔"

"ابو جی سارا دولہا پن نکال دیں گے' آپ بے فکر رہیں۔ آج تو وہ رن پڑے گا' وہ رن پڑے گا..." وہ دادی کی زبان بولنے لگی۔

"کیوں' ایسا کیا ہوا؟" تاج بیگم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

جواباً وہ انہیں ساری داستان سنانے لگی۔

❁ ❁ ❁

وہ تینوں سر جھکائے بیٹھے تھے' اس لیے چہروں کے تاثرات پوشیدہ تھے۔ دادی جان بڑے اطمینان سے اپنے تخت پر براجمان پاندان کھولے نجانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔

تاج بیگم پریشان پریشان سی کرسی کے بالکل کنارے پر ٹکی ہوئی تھیں اور قطب الدین صاحب زور و شور سے گرج برس رہے تھے۔

"یعنی اس قدر نالائق اولاد اور اتنی شوریدہ سری۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔ لڑکے' وہ بھی جوان جہان لڑکے۔"

"ماشاء اللہ کہو قطب الدین!" دادی جان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"باپ کا بوجھ بانٹنے کی کوشش تو کیا کریں گے' الٹا بوجھ بن کر گلے سے لٹکیں گے' سر پر چڑھ کر ناچیں گے۔ دیدہ دلیری دیکھو ان کی' میری آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔"

غصے سے وہ جھاگ اڑانے لگے۔

"چل بس کر قطب الدین! جانے دے' بچے ہی تو ہیں۔" دادی جان نے پاندان کی تلاشی موقوف کی۔

"یہ بچے ہیں؟ یہ... یہ حضرت... یہ بچے ہیں۔ آدھے بال سفید ہیں اس کے۔" انہوں نے جمشید کا

سر اونچا کیا۔

"نزلہ ہے ابو جان!" وہ منمنایا۔

"جی ہاں... بے چارہ کسی پر کرتا نہیں۔ اندر ہی اندر بال سفید کر رہا ہے بھائی جان کے۔" جنید منہ ہی منہ میں بول گیا۔

"یہ تم کیا من من کر رہے ہو۔" قطب الدین صاحب نے اسے گھورا۔

"بھائی جان کے نزلے کی تعریف کر رہا ہے ابو جان!" غزل جلدی سے بولی۔

"تو چپ رہ!" دادی نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ "چلو وہ دونوں تو لڑکے ہیں' اس کو بھی پر لگے ہوئے ہیں۔ ان کے برابر کی شریک رہتی ہے ہر کام میں اور پھر ہمیں کچھ بتاتی بھی نہیں۔ گھنی کہیں کی۔"

"میں نے ہی تو ابو جی کو بتائی ہے پوری بات۔" اس نے احتجاج کیا۔ جنید نے جل کر کہنی اس کی پسلی میں ماری۔

"ابو جی!" اس نے چیخ ماری۔

قطب الدین صاحب جو اپنے کسی خیال میں پہنچ چکے تھے پھر چونک اٹھے۔

"خیر... خیر... میں تم لوگوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی زبردستی نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں' تم لوگ اچھی طرح اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کرو' سکون کے ساتھ جو پڑھنا چاہتے ہو' پڑھو لیکن یہ بچوں والی حرکتیں اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ اپنی عمروں کے مطابق چلو' اب تمہارے کھیلنے کودنے کے دن نہیں ہیں۔ کچھ عرصے بعد شادیاں ہوں گی تو سارا بچپنا اچھی طرح نکل جائے گا۔ اس سے پہلے اپنی ذمہ داریاں پہچان لو' یہی بہتر ہے۔"

وہ چند لمحوں کے لیے رکے۔

"اور اگر اوپری پورشن کرائے پر چڑھانے سے تم لوگ بے سکون ہوتے ہو تو میں اپنا فیصلہ بدل لیتا ہوں۔" جنید اور جمشید نے چونک کر سر اٹھایا اور ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"تم لوگ آرام سے اوپر رہو' اپنی پڑھائی کرو' کوئی ڈھنگ کا تعمیری کام کرو' لیکن اپنی دادی جان اور ماں کا حال احوال پوچھ جایا کرو' ان کے کام کر دیا کرو' ان کی پکار کا جواب دیا کرو' اچھے بچوں کی طرح۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے' اب بچپنا چھوڑ دو۔" غزل کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

قطب الدین صاحب نے مسکرا کر ایک چپت اس کے سر پر لگادی۔

"یار جنید!" جمشید نے گویا غزل کی بات سرے سے سنی ہی نہیں۔ "وہ ہنستی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہے نا۔"

"اور بھائی جان! آپ نے غالباً دوسری والی کی آواز نہیں سنی۔ جیسے چاندی کے برتن میں سکے کھنکتے ہوں۔" جنید ایک ٹک خلا میں گھور رہا تھا۔

"یار! اس کے بال بھی اچھے ہیں۔ شیمپو کے ایڈ میں بھی آسکتی ہے۔"

جنید نے چونک کر بھائی کو دیکھا۔

"آپ مارکیٹ میں کوئی شیمپو انٹروڈیوس کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں کیا؟ ابھی سے آپ کو ماڈل کی تلاش ہے۔"

"اُفوہ' بدھو' میں تو اس کے بالوں کی تعریف کر رہا تھا۔" جمشید جھلا کر بولا۔

"تو اس قدر غیر شاعرانہ بلکہ تاجرانہ زبان استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھے سیدھے گھٹاؤں سے تشبیہ دے دیں یا آبشار کا لقب عطا کر دیں یا ناگن کا ذکر کریں۔"

"یار جنید! مجھے خیال آیا۔ انکل نے بے چاریوں کے نام رکھنے میں کچھ زیادہ ہی زیادتی نہیں کر ڈالی۔ اب بھلا بتاؤ' اتنی حسین لڑکی کو شمشاد کہہ کر پکاریں تو دل پر کیا گزرے گی۔"

"آپ کو نک نیم کی افادیت کا احساس نہیں بھائی جان! ایسے نازک موقع جب زندگی میں آجائیں تو انہیں نک نیم کی برکت سے ٹالا جاتا ہے۔ مثلاً' شمی' شمو یا شادو۔" جنید نے بزرگوار بن کر بڑے بھائی کو

سمجھایا۔

"اس حساب سے تو تم خطرے کی زد میں آتے ہو۔" جمشید نے تدبر کیا۔ "آپ ذرا دلشاد کے تک نیم اسی طرز کے بناؤ تو حسینہ کے روٹھ جانے کا خطرہ ہے۔"

"آپ میری فکر چھوڑیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں تو اسے یوں پکاروں گا کہ اس کا دل شاد ہو جائے گا۔"

غزل ہونقوں کی طرح باری باری ان دونوں کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا بول رہے ہیں آپ دونوں۔ آپ لوگوں کا دماغ تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں... اب تم جا کر امی جی کو ساری بات بتا دو۔" جنید جل کر بولا۔ "دادی جان نے تمہیں بالکل درست القابات سے نوازا تھا۔ میں تو سوچ رہا ہوں' اپنے گروپ سے تمہارا نام ہی خارج کر دوں۔ میر جعفر کہیں کی۔"

"کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے پیارے پیارے جوان بھائی کنوارے ہی رہ جائیں۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ اچھی اچھی پیاری پیاری بھابھیاں تمہارا دل بہلانے کو اس گھر میں آئیں۔" جمشید نے اسے جذباتی کرنا چاہا۔

"بھابھیاں؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہونے والی!" جنید نے لقمہ دیا۔

"لو تو..." اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"یار جنید! اب ابو جی کو کیسے منائیں۔" وہ ہنوز اسی سوچ میں تھا۔

* * *

"آنٹی! کیسے یقین دلاؤں آپ کو۔ اتنے کشادہ بیڈ رومز' وسیع لاؤنج' اٹالین کچن' ہوادار ٹیرس' کھلی چھت۔ بھلا کیا نہیں ہے اس گھر میں اور پھر اتنا کم کرایہ اور... اور... اتنے اچھے پڑوسی۔" وہ تھوڑا سا شرمایا۔

"لو تے ٹھیک اے پتر... پر اوس دن توں کہندا سی چنگے کپڑوں وچ اک مائی پھردی اے او تے او کون اے فیر؟" نور بانو ہنوز فکر مند تھیں۔

"وہ تو ہماری دادی ہیں۔" جمشید جلدی سے بول پڑا۔ "دادی جان۔"

نور بانو اور خورشید علی نے حیرانی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"پر اے منڈا اوس دن کہندا سی او کوئی بدروح اے۔"

جنید بغلیں جھانکنے لگا۔ جمشید ہڑبڑا کر رہ گیا۔

"وہ... آنٹی! ایسی بات نہیں۔ اس نے یقیناً مذاق کیا ہو گا۔ یہ بڑا نٹ کھٹ ہے۔ ایسے ایسے مذاق کرتا ہے کہ اس کی ہر کسی سے کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔"

"اور جھٹ پٹ صلح بھی۔" جنید جلدی سے بولا۔

"ہٹ ہٹ..." آنٹی نے گویا مکھی اڑائی۔ "جانے دے پتر... او مذاق سی۔"

"آہو آنٹی جی! ہنڈرڈ پرسنٹ مذاق سی... تسی میرا یقین کرو ناں۔"

"صدقے جاواں۔" نور بانو کھل اٹھیں۔ "ساڈی زبان بولدا اکنا سوہنا لگدا اے۔" جنید شرما کر رہ گیا۔

"آپ لوگ آ جائیں نا آنٹی۔" جمشید نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے خورشید علی کی جانب دیکھا۔

"اچھا بیٹے جی! آپ اتنا اصرار کرتے ہو تو میں آپ کے والد سے پھر بات کرتا ہوں۔"

"یاہو..." جنید کا نعرہ بلند ہو گیا۔

جمشید نے گھبرا کر اسے روکا۔

* * *

سب کچھ بہت آسانی سے ہو گیا تھا۔

قطب الدین صاحب بیٹوں کو رضا مند پا کر بہت آسانی سے مان گئے تھے۔ یہ بات ان سے پوشیدہ رکھی گئی تھی کہ جمشید اور جنید ان لوگوں کو منانے ان کے گھر گئے تھے۔

جمشید اور جنید نے سارا سامان مختلف کمروں میں

سیٹ کروانے میں ان لوگوں کی بے حد مدد کی تھی۔

"بیٹے جی! کیوں زحمت کرتے ہو۔" خورشید علی صاحب نے انہیں بہت سمجھایا تھا۔ "میں مزدور بلوا لیتا ہوں۔"

"نہیں انکل جی! ہمارے ہوتے مزدوروں کی کیا ضرورت ہے۔" جمشید جوش بھرے انداز میں بولا تھا۔ جنید نے اسے چپکے سے کہنی ماری تو وہ جھلا اٹھا۔

"کیا ہے یار! پسلیاں چھلنی کر دی ہیں تم نے میری' اتنی کہنیاں مارتے ہو۔"

سامان سیٹ ہو گیا تو ایک دن وہ لوگ مکمل طور پر شفٹ ہو گئے۔

"یار جنید!" جمشید بے حد پریشان تھا۔

"جی بھائی جان۔"

"تم نے کچھ نوٹ کیا یار!"

"بہت کچھ بھائی جان!" وہ گہری سوچ میں تھا۔

"انکل خورشید' آنٹی نور بانو اور ایک بڑے چاچا میاں۔"

"وہ انکل خورشید کے بڑے بھائی ہیں۔"

"کل تین افراد اب تک نظر آئے ہیں اور گھوم پھر کر یہی نظر آ رہے ہیں۔ جنہیں نظر آنا چاہیے وہ آخر کہاں ہیں؟"

"میں بھی اسی سوچ میں ہوں۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"مگر میاں آگئی ہیں بھائی جان!" پھر وہ بولا۔ "شاید وہ مری' سوات کی سیر کو نکل گئی ہوں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ انکل کی سگی بیٹیاں نہ ہوں۔ یونہی ان کے ساتھ آ گئی ہوں۔"

"نہیں' وہ ان کی بیٹیاں ہی ہیں۔ ان کے علم گواہی دیتے ہیں اور پھر ان کے بیڈ رومز بھی تو ہیں اوپر۔"

"پھر چکر کیا ہے یار! انہیں یہاں آتے ہی انہوں نے ہم سے پردہ کرنا تو شروع نہیں کر دیا۔"

"غزل کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔ ہر چند کہ وہ ہماری غداری پر ہم سے خفا ہے پھر بھی اسے منانا پڑے گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو' اس کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔ آخر کو وہ ہماری ننھی منی پیاری سی بہن ہے۔"

* * *

"یہ لو پائن ایپل کیک... اور یہ کھوپرا بسکٹ... یہ بوندیاں... جلدی سے ابال کر دہی میں ڈال لو۔" جمشید نے جلدی جلدی سب چیزیں' بہن کو تھمائیں۔

اس نے بیزاری سے شاپرز لے کر کاؤنٹر پر پٹخے۔

"جنید... یار! چائے کا پانی تو رکھ دو۔"

"کیا ہے بھائی جان! برتن میں نے صاف کیے' چنے میں نے بنائے' اب چائے بھی میں ہی بناؤں۔ اس کام چور سے کہیں نا' یہ بھی کچھ کرے۔"

"میں "ان" کو جو بلا کر لاؤں گی' اس سے بڑا بھی کوئی کام ہے؟"

"اچھا اچھا... زیادہ احسان نہیں جتاؤ۔ اتنا سا کام کیا کر رہی ہو' سر پر چڑھی جا رہی ہو۔"

"اچھا.... پھر بلا لاؤ خود ہی۔" وہ پھر روٹھ گئی۔

"ارے میری پیاری بہن!" جمشید نے اسے ساتھ لگا لیا۔ "یار جنید! کیوں تنگ کرتے ہو یار.... چھوٹی سی تو بہن ہے۔"

تاج بیگم اسی آن کچن میں داخل ہوئی تھیں۔

"یہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ حیران ہوئیں۔

"وہ.... وہ.... امی جان.... غزل نے اپنے کرائے داروں کو چائے پر مدعو کیا ہے نا؟ وہ اس لیے...."

"غزل نے مدعو کیا ہے؟" انہیں حیرت کا دورہ پڑا۔

"جی ہاں۔ وہ اصل میں... اس کی سہیلیاں...." اس نے غزل کو کہنی ماری۔ "بتاؤ نا" تسی!" آخری لفظ وہ ہونٹوں میں دبا گیا تھا۔

"جی ہاں امی.... میں نے ہی مدعو کیا ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔ "بلکہ جا رہی ہوں مدعو کرنے۔ بھائی جان سے چیزیں منگوائی ہیں میں نے۔"

"تم جاؤ نا غزل انہیں بلا کر لے آؤ۔" جمشید جلدی سے بولا۔ "جب تک ہم لوگ برتن سیٹ کر لیتے ہیں۔ امی! آپ اچھی سی چائے بنا لیں نا۔"

"ایک تو تم لوگ بھی.... بنا کچھ پوچھے گچھے شروع ہو جاتے ہو۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے ساس پین نکالنے لگیں۔

غزل بھائی کا اشارہ پا کر باہر چل دی۔

جمشید اور جنید ڈرائنگ روم میں برتن سیٹ کرنے لگے۔

کچھ ہی دیر میں خورشید علی صاحب، نور بانو بیگم اور چاچا جی خوش خوش چلے آ رہے تھے۔

"بھئی یہ تکلف کس لیے؟" خورشید علی صاحب میز دیکھ کر مزید خوش ہوئے۔

"تکلف کیسا انکل.... آپ کا اپنا گھر ہے۔" جمشید نے دانت نکالے۔ "صرف چائے ہی تو ہے۔"

وہ لوگ بیٹھ کر چیزوں سے انصاف کرنے لگے۔

جمشید اور جنید نے پریشان نظروں سے انہیں اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

جنید نے اپنا مخصوص اشارہ یعنی کہنی کا استعمال کیا۔

غزل اچھل ہی پڑی۔

جنید کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ کر وہ غصے میں بھر کر بولی تھی۔

"انکل، آنٹی.... آپ لوگ میری سہیلیوں کو کیوں نہیں لائے؟ ان کے لیے تو میں نے اتنا اہتمام کیا تھا۔"

"ہا.... ہائے.... میری دھی.... کملی!" نور بانو ہنس ہنس کر دوہری ہو گئیں۔ "او تہناں تے ہاسٹل وچ رہندی آں.... فیصل آباد!"

"ہاہاہا...." خورشید علی بھی ہنس رہے تھے۔ "پچھلے دنوں آئی ہوئی تھیں تو ہم لے آئے۔ اب تو دو تین مہینے بعد ہی آئیں گی۔"

چاچا جی چیزوں سے یوں انصاف کر رہے تھے گویا انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ خورشید علی، نور بانو، دادی جان اور تاج بیگم بھی مصروف تھے۔

غزل نے ان دونوں کو ٹھینگا دکھایا اور گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

"بھائی جان!" جنید تیورا کر جمشید پر گر پڑا تھا۔

"میرا کمرہ۔"

✲

copied from web

the end ***** the end